صلح اور جنگ

عقل و فطرت کی روشنی میں

(از قلم حقیقت رقم)

حضرت سید العلماء مولانا السید علی نقی النقوی دام ظلہ العالی

(مطبوعہ)

سرفراز قومی پریس لکھنؤ

امامیہ مشن کے خدمات کا نمبر (۱۹)

صلح اور جنگ

"عقل و فطرت کی روشنی میں"

کئی برس سے "جنگ" "جنگ" کی آواز سے کان بھر گئے ہیں۔ کچھ خبر نہیں کہ حالات کب بدلیں گے اور امن کی فضا کب نظر آئے گی

اس دور کے شروع ہونے کے بعد ہی سرکار سید العلماء دام ظلہ نے مدرسۃ الواعظین میں دس روز تک "صلح اور جنگ" کے موضوع پر مواعظ ارشاد فرمائے۔ افسوس ہے کہ وہ پورا سلسلہ شارٹ ہینڈ سے قلم بند نہیں ہو سکا مگر ابتدائی چند روز کا بیان محفوظ ہو سکا تھا جو ممدوح کی نظر ثانی کے بعد موجودہ رسالہ کی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

امید ہے کہ اسکو مذہبی اور سیاسی دونوں حلقے غور و توجہ سے ملاحظہ کرینگے

والسلام خادم مذہب جنرل سکریٹری امامیہ مشن لکھنؤ

۳ رجب سنہ ۶۲ھ

اَلحمد للہ رب العالمین وَالصّلوٰۃ علیٰ سید الانبیاء والمرسلین وَآلہ الطاہرین :-

"صلح اور جنگ" یہ موضوع خود ہمیشہ سے خیالات کا محاذ جنگ رہا ہے اور مختلف جماعتوں کے نظریات ہمیشہ سے اس کے بارے میں جداگانہ رہے ہیں - اور عالم انسانی کا فیصلہ اس کے متعلق افراط وتفریط کے دو عملے میں گرفتار ہو گیا ہے جس طرح سے سیاسی اور اجتماعی حیثیت سے اس موضوع نے ایک اہمیت حاصل کر لی ہے - اور دنیا کے افکار وخیالات کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے اسی طرح مذہبیات میں بھی اس نے ایک اچھی خاصی اختلافی صورت پیدا کر دی ہے - عیسائیوں کے یہاں انجیل مقدس میں ایک خاص طرح کی تعلیم ہے جو سراسر صلح کی دعوت دیتی ہے - موجودہ زمانہ میں اور اس سے پہلے ہمیشہ اُن مذاہب کے خلاف جنھوں نے کسی موقع پر تلوار اُٹھائی ہے یہ الزام عائد کیا جاتا رہا ہے کہ انھوں نے دنیا کے امن وامان کو صدمہ پہونچایا اور اپنے مقصد کی تکمیل کو تلوار سے انجام دیا -

موجودہ زمانہ میں بھی اگر آپ غور کیجئے تو آپ کو متضاد خیالات نظر آئیں گے
ایک طرف تو ہندوستان میں جو قومی اور سیاسی رہنما کی حیثیت سے تسلیم کئے
جاتے ہیں یعنی گاندھی جی اُن کی تعلیم ہے کہ انسان کو ہر وقت عدم تشدد
سے کام لینا چاہیئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ خود کانگریس کی تاریخ میں ایسی
صورتیں پیش آئیں جو اس اصول کے یا اس تلقین کے خلاف ہوں مگر لفظی
حیثیت سے اسکے اوپر زور دیا جاتا رہا ہے اور اس کے اوپر بہت کچھ لکھا
بھی جا چکا ہے کہ عدم تشدد کا آلہ کار جنگ کے سدباب کے لیے بہترین
چیز ہے اسکی تشریح کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان کو بہرصورت غیر تشدد
طریقہ اختیار کرنا چاہیئے یعنی کسی وقت اسکی جانب سے سختی نہ ہونے پائے
اسکے علاوہ دنیا کی متمدن سلطنتیں اکثر ان میں سے صلح کی علمبردار اپنے
تئیں قرار دیتی ہیں اور صلح کی تبلیغ الفاظ اور اعلانات کے ذریعہ کی جاتی ہے
اسی صلح کے قائم کرنے کے لیے مجلس اقوام کی تشکیل کی گئی اور مجلس اقوام
کا مقصد یہ تھا کہ دنیا کے تمام ممالک متحد رہیں اور وہ ایسی صورتیں اختیار
کریں کہ جن کے ذریعہ سے دنیا میں جنگ نہ ہونے پائے۔ اسکے لیے تخفیف
اسلحہ کی تجویز پاس کی گئی کہ تمام حکومتیں اپنے اسلحہ کو کم کردیں یہ اور
بات ہے کہ اسکے اوپر عمل نہیں ہو سکا۔ اور خود وہ لوگ اس پر عمل نہ کر سکے
جو در اصل اس تحریک کے پیش کرنے والے تھے اور جو اس چیز کے مؤیدین تھے

چہ جائیکہ وہ لوگ جنھوں نے پہلے ہی اس طریقہ کار کو ٹھکرا دیا اور اسکی قبول کرنے اور اقرار کرنے پر آمادہ نہ ہوئے بہرحال تخفیف اسلحہ کی تجویز اسی غرض سے لائی گئی تھی کہ دنیا میں جنگ کا سدباب ہو جائے اور امن و امان دنیا میں قائم ہو سکے۔ اسکے برخلاف ایک دوسرا نظریہ عجیب و غریب ہے یعنی ایک طرف گاندھی جی کا عدم تشدد بلا استثنار اور دوسری طرف جرمنی میں ہر ہٹلر۔ وہاں اصول یہ ہے کہ ملک کو جنگ کے لیے ہمیشہ آمادہ رہنا چاہیئے۔ یعنی گویا مقصد زندگی جو ہے وہ جنگ پر منحصر ہے۔ صلح پر نہیں ہے۔ جرمنی کے رہنمایان ملک یہ تلقین کرتے رہے ہیں کہ مقصد حیات جنگ ہے اور یہ ایک عجیب اصول ہے جس کی وہاں ہمیشہ سے تبلیغ ہوتی رہی مگر اسپر تعجب بھی نہیں کرنا چاہیے۔ اس وقت دنیا کے فلسفہ میں ایک بہت بڑی حیثیت سمجھی جاتی ہے ارسطو کی۔ ارسطو نے اپنی کتاب میں یہ سب سے پہلے لکھ دیا ہے کہ وہ قومیں جو غلامی کی خوگر ہو چکی ہیں اور جن میں قوت مدافعت باقی نہیں رہی ہے اُن پر بزور شمشیر قبضہ حاصل کرنا انسان کا انسانی حق ہے۔ اور در اصل یہ ارسطو کی تعلیم ہی کا نتیجہ تھا جس کی وجہ سے سکندر اعظم نے گویا یہ اپنا قانونی حق قرار دے دیا تھا کہ وہ دوسرے ممالک پر فوج کشی کرکے اُن پر قبضہ کرے اور اس شریعت پر تمام ملک گیر اور فاتح سلاطین کی سنت قائم رہی۔ جرمنی میں ہمیشہ سے اسکی تبلیغ ہوتی رہی اور اسی اصول

پر اپنی قومیت کی عمارت قائم کی گئی۔ چنانچہ جرمنی کے ایک وقت میں بہت بڑے صاحب اقتدار حاکم فریڈرک اعظم نے بھی صاف صاف اس کا اعلان کیا ہے کہ جنگ تجارت ہے اور اس میں اخلاق کا خیال سارا کام بگاڑ دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی تصورات سے متاثر ہونے کی ضرورت نہیں ہے اگر ہم اس میں اپنے کو اُلجھا دیں تو کوئی کام ہم نہیں کر سکتے۔ یہ ایک ایسا خیال ہے جو اعلان کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے اور گویا یہ قوم کی ہر ہر فرد کی رگ و پے میں پھیلا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ سابق سلاطین کی ڈالی ہوئی داغ بیل تھی جس پر ہر ہٹلر نے عمارت قائم کی۔ اور ہر ہٹلر نے جیل خانہ میں جو ۵۰۰ صفحات کی کتاب لکھی ہے اور جس میں جرمنی کے لیے ایک زندگی کا لائحہ عمل مرتب کر دیا ہے اور وہ کتاب ہاں انجیل سے زیادہ باوقعت اور قابل عزت سمجھی جاتی ہے۔ اس میں اس نے صاف لکھا ہے کہ فطرت سیاسی حدود کی پابندیوں سے بے نیاز ہے۔ جرأت اور ہمت میں جو انسان سربلند ہو وہ اس کا محبوب فرزند ہے اور فطرت اسکے سر پر تاج حکمرانی رکھنے کی آرزومند ہے کیونکہ ایسے ہی انسان کو صرف زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ جگہ کی تنگی باشندوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیتی ہے اس لیے جرمنی کو چاہیے کہ وہ اپنے افلاس کو دور کرے۔ لیکن اس مقصد کی تکمیل کے لیے کوئی ہم کو زمین کیوں دینے لگا۔ جو چیز خوشی سے نہیں دی جاتی ہے وہ ہمیشہ چھیننے سے حاصل ہوتی

وہ کہتا ہے کہ اتحاد صلح کی غرض سے کیا جائے اس کے معنی کوئی بھی نہیں ہیں جس اتحاد کا مقصد مستقبل کی جنگ آزمائی نہ ہو وہ بے معنی اور بے سود ہے۔ لڑنے کے لیے ہی تو اتحاد کیا جاتا ہے جس میں استطاعت مدافعت نہیں اس کے ساتھ دوستی ایک قسم کا جنجال ہے جو لوگ صلح کی آوازیں بلند کرتے ہیں تو یہ دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جماعت ہے جو فطرۃً صلح کرتی ہے اور یہ پست ہمت اور بزدلوں کی جماعت ہے۔ دوسری جماعت آواز صلح اس لیے بلند کرتی ہے تاکہ اُن کا حریف بے فکر ہو جائے اور اس کو حملہ کی تیاری میں اچھا موقع ہاتھ آجائے۔ وہ کہتا ہے کہ نسل انسانی کو جو کچھ فروغ حاصل ہوا ہے وہ مسلسل نبرد آزمائیوں کا نتیجہ ہے۔ اسکے خیال میں صلح و آشتی کا تصور اُس وقت ہو سکتا ہے جبکہ کل ربع مسکوں ایک ہستی کے زیر فرمان ہو۔ زندگی میں پہلے لڑائی ہے تب امکان امن ہے۔ اب آپ ملاحظہ کیجیے کہ ان خیالات میں کتنا زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کہیں تو حضرت عیسٰی کی انجیل میں یہ تعلیم کہ کوئی ایک رخسارہ پر طمانچہ مارے تو تم دوسرا رخسارہ بڑھا دو۔ یعنی کبھی لڑو نہیں اور آپ کے ہندوستان میں بہت سی ایسی جماعتیں ہمیشہ سے موجود رہی ہیں جو کسی وقت میں بھی جنگ کو اچھا نہیں سمجھتیں۔ بعض مذاہب تو ایسے ہیں کہ جن میں کسی ذی روح کا خون بہانا نہ چاہیے۔ چاہے وہ اپنے کو ایذا بھی پہنچائے۔ یعنی وہ جانور جو

انسان کو تکلیف پہونچاتا ہی اس کا قتل کرنا بھی کسی طرح سے جائز نہیں ہے
تو کہاں یہ تعلیم اور کہاں وہ تعلیم کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہے وہ جنگ ہی۔ اور
جنگ کے سوا انسانی زندگی کا مقصد دنیا میں اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا
اگر آپ غور کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کوئی بھی نظریہ مشکلات
سے خالی نظر نہیں آتا۔ اگر اس تعلیم کو صحیح سمجھ لیا جائے کہ دنیا میں جنگ
ہی جنگ ہی اور صلح کوئی چیز نہیں ہی اور فرض کیا جائے کہ ہر جماعت
اور ہر فرد ان ہی خیالات کو جگہہ دے کر قدم آگے بڑھائے تو یہ دنیا کا نظام
ختم ہو جائے گی۔ اور اس کا وجود ہی باقی نہیں رہے گا۔ اگر جنگ موافق فطرت
ہے تو وہ ہر ہر نوع اور ہر ہر فرد کے لیے ضروری ہونا چاہیئے۔ مگر جرمنی
نے مثلاً ایک نسل کو اپنا مرکز اتحاد قرار دیا ہے۔ اور اس ملک نسل کو متحد
بنا کر دوسری نسلوں سے وہ مقابلہ کرنے کے لیے درپے ہی تو اس نسل کے درمیان
جب وہ اپنی قوم قرار دیتے ہیں ان کو بہر حال وہاں کے افراد کے درمیان
صلح پسندی اور جذبۂ اتحاد پروری کی تربیت کرنا ضروری ہی۔ اور اگر وہاں
ایسا نہیں ہی تو وہ خود اپنے درمیان ایک دوسرے سے مصروف پیکار
ہو جائیں گے اور اسکے بعد ان کا نظام داخلی خود اپنے ملک کی تباہی بربادی
کا پیش خیمہ ہوگا۔ تو اس سے معلوم ہوتا ہی کہ جنگ کی اتنی ہمہ گیر تبلیغ
اور تلقین اصول فطرت کے بالکل ہی خلاف ہی۔ اور اگر تمام افراد انسانی

کے دماغ میں ہٹلریت پیدا ہو جائے تو یہ تمام کائنات چند دن میں ختم ہو جائے گی۔ دوسری طرف یہ خیال کہ بس عدم تشدد۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح اصول فطرت کے موافق ہو سکتا ہے۔ جب پولینڈ کے اوپر ہٹلر حملہ کر دے تو کون سا غیر متشدد طریقہ پولینڈ اختیار کرے اور کون سا وہ طریقہ ہی جس کے ذریعہ سے وہ عدم تشدد میں کامیاب ہو سکے عدم تشدد ہمیشہ اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہی جب تک کہ فریق مقابل عدم تشدد سے متاثر ہونے کے قابل ہو لیکن اگر کوئی فریق عدم تشدد سے متاثر ہونے کے قابل ہی نہیں رہا ہی تو ایسی صورت میں عدم تشدد تشدد کو دعوت دیتا ہی۔ ایک رخسارہ پر طمانچہ پڑنے کے بعد دوسرا رخسارہ پیش کرنے پر اگر مقابل اتنا شریف مزاج ہی کہ شرما کر ہاتھ ہٹا لے تب تو یہ اخلاق کے لیے تعلیم بہت ہی اچھی ہے لیکن اگر ایک رخسارہ پر طمانچہ آتے دیکھ کر دوسرا رخسارہ بڑھانے سے وہ تلوار لے کر گردن قلم کر دے اور پھر اسی مثال کو سامنے رکھ کر اس کی ہمت اتنی بڑھے کہ وہ دوسرے بے گناہوں کو اپنے ظلم و تشدد کا نشانہ قرار دے تو اس ظلم اور تشدد کی جو اس ظالم کے ہاتھوں ہو رہا ہے ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ اُسی عدم تشدد پر جو پہلے شخص نے کیا تھا۔ یعنی یہ عدم تشدد دنیا میں تشدد کے اضافہ کا باعث ہی۔ اگر تشدد دنیا میں بُری چیز ہے تو ایسی

صورتیں اختیار کرنا صحیح نہیں ہیں جن سے تشدد میں اضافہ ہو۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں جو قصاص کا حکم آیا ہے تو اس میں ارشاد کیا گیا ہے۔ ولکم فی القصاص حیوٰۃ (یعنی) تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔ حالانکہ اس قصاص سے جان لی جاتی ہے مگر نتیجہ اس کا جانوں کا بچانا ہے یعنی اگر قانون قصاص نہ جاری کیا جاتا تو دنیا میں واقعات قتل زیادہ پیش آتے۔ قانون قصاص کے جاری کرنے سے اگر ایک شخص کی جان گئی۔ شرعی قانون کے ذریعہ اور قاتل کو سزا دی گئی تو بہت سی زندگیوں کے تلف ہو جانے کا سد باب ہو گیا۔ اس بنا پر شخصی حیثیت سے اگرچہ جان جاتی ہے مگر اس کی وجہ سے اجتماعی حیثیت سے بہت سے لوگوں کو زندگی حاصل ہو جاتی ہے لیکن اس قسم کا عدم تشدد جس کا نتیجہ تشدد کو بڑھانا ہے۔ حقیقتاً عدم تشدد نہیں ہے کیونکہ براہ راست وہ عدم تشدد ہے مگر سرچشمہ ہے وہ تشدد کی ہمت افزائی کا اور اس کے ذریعہ سے دنیا میں تشدد بڑھتا ہے۔ چور ایک گھر میں جاتا ہے۔ اور مالک مکان دروازہ کھول دیتا ہے کہ تشریف لائیے تمام اسباب حاضر ہے لے جائیے وہ تمام اسباب لے جاتا ہے اس کی ہمتوں اور ارادوں میں اور تقویت ہوتی ہے اور وہ بہت سے گھروں پر اور ڈاکے ڈالتا ہے اس صورت میں یہ جو مال لوٹا گیا ہے اور یہ ظلم و ستم جو ہوا ہے اس کی ذمہ داری کس پر ہوگی اس پہلے شخص پر کہ جس نے مال اٹھتے وقت چور سے

مدافعت نہیں کی تھی۔ اور اگر وہ دفاع کرتا تو یہ روز بد دیکھنا نصیب ہوتا۔
حقیقت یہ ہے کہ جنگ غیر فطری چیز ہے اسلئے کبھی دائمی نہیں ہوسکتی
مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ جنگ ایک طرح سے فطری چیز بھی ہے
دیکھنا یہ ہے کہ جنگ کے خلاف فطرت ہونے کے کیا معنی اور فطری ہونا اسکا
کس اعتبار سے ہے اس میں شبہ نہیں کہ نظام انسانیت ہو بہو نظام کائنات
کے ساتھ متحد ہے اور جو قوانین اور جو اصول نظام کائنات میں جاری ہیں
اُن سے نظام عالم انسانی مستثنیٰ نہیں ہوسکتا۔ یہ اور بات ہے کہ اسکے اوپر
انسان کی رفعت اور بلندی کی وجہ سے حدود اور قیود عائد ہو جائیں اس
میں کچھ اور پابندیاں قرار دی جائیں یہ دوسری چیز ہے۔ مگر نظام انسانی
نظام کائنات کے بالکل برخلاف اور متضاد نہیں ہوسکتا۔ یہ وہ چیز ہے
کہ جس کو مختلف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور اس کو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ یہ
انسان خود ایک بہت بڑا عالم ہے یعنی تمام دنیا عالم اصغر ہے اور انسان
عالم اکبر ہے یعنی جو کچھ تمام دنیائے کائنات میں قانون نظر آتے ہیں وہ
ہی انسان کے اندر اسی طرح مضمر ہیں۔ نظام طبعی کی دنیا میں جس قوت
دیکھا جاتا ہے تو قدما اور متاخرین اگلے اور پچھلے سب نے اپنے اپنے الفاظ
میں یہ دکھلایا ہے کہ نظام کائنات میں دو چیزیں موجود ہیں ایک جذب
اور ایک دفع۔ یعنی گوارائے طبع یا موافق طبع چیزوں کا اپنی طرف کھینچ کر

اپنی طرف ملانا۔ اور ناگوار طبع یا خلاف طبع چیزوں کا اپنی طرف سے دُور کرنے کی کوشش کرنا یا ہٹانا۔ دنیا کی ہر چیز میں کم و بیش یہ دونوں صفتیں پائی جاتی ہیں۔ موجودہ زمانہ کے لوگوں نے اسکی مثالیں دے کر اسکی زیادہ تشریح کردی ہے۔ چیزوں میں آپ کو وزن محسوس ہوتا ہے یعنی کوئی چیز بلی اٹھائی جائے تو وہ سنگین معلوم ہوتی ہے۔ وزن اور سنگینی قوت جذب کا نتیجہ ہے یعنی ہر چیز اپنے مرکز کی طرف ہٹانے میں وزنی معلوم ہوتی ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے مرکز کی طرف ایک خاص کشش رکھتی ہے جتنا چیز اپنے مرکز کی طرف زیادہ کھنچے گی اتنا اس کا آپ کو وزن زیادہ محسوس ہوگا۔ جن چیزوں میں قوت جذب کم ہے وہ ہلکی ہوں گی اس میں مقدار کی کمی یا زیادتی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ایک بڑی چیز وزن میں سبک ہو اور ایک بہت مختصر اور چھوٹی سی چیز وزن میں زیادہ ہو۔ روئی کا ایک بہت بڑا گٹھا ایک طرف رکھئے اور تھوڑے سے لوہے کو ایک طرف رکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ روئی کا گٹھا دیکھنے میں اتنا بڑا معلوم ہوتا ہے لیکن وہ ہلکا ہے اور یہ لوہے کا ٹکڑا جو مقدار میں مختصر سا معلوم ہوتا ہے یا پتھر کا ٹکڑا جو مقدار میں کم نظر آتا ہے اس کا وزن زیادہ ہے، تو بات کیا ہے؟ یہی کہ اس میں قوت جذب زیادہ ہے اور اس میں قوت جذب کم ہے ایسی شاید کوئی شے عالم میں نہیں ہے کہ جس میں قوت جذب بالکل ہی نہ ہو۔ اور اگر بالکل نہ ہو تو اس کے

اجتماع سے کوئی وزن ہی نہ پیدا ہوگا۔ یقیناً ہر شے میں کچھ نہ کچھ وزن ضرور ہی پایا جاتا ہے اور اس کو امیر المومنینؑ نے علم باری کی تفصیل میں ارشاد فرمایا ہے کہ "مثقال کل ذرۃ" یعنی ہر ہر ذرہ کائنات کا وزن جانتا ہے۔

بہرحال میرا مقصد یہ ہے کہ وزن نتیجہ ہے قوت جذب کا۔ یعنی وہ چیز درحقیقت اپنے مرکز سے ہٹنا نہیں چاہتی گو آپ اس کو ہٹانا چاہتے ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ جتنا اس میں اپنے مرکز کی طرف متحد رہنے کی قوت زیادہ ہے اتنی ہی آپ کو اس کے مرکز سے جدا کرنے میں قوت زیادہ صرف کرنا پڑتی ہے قوت دفع سے ایک شے میں سختی پیدا ہوتی ہے۔ روئی اگر ایک بڑی مقدار میں آپ کو معلوم ہوتی ہو۔ اور اس کا قطر فرض کیجئے کہ ایک گز ہے۔ لیکن آپ اس کے اوپر ہاتھ رکھئے اور دبائیے تو اس کی وسعت بہ نسبت سابق کے بہت گھٹ جائے گی اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں قوت دفع بہت کم ہے مگر پھر بھی ایسا نہیں ہے کہ اس میں قوت دفع بالکل نہ ہو اس لیے کہ یہ روئی کبھی دبتے دبتے ایک وقت وہ آئے گا کہ وہ اب آپ کے دبانے کو قبول نہیں کرے گی یعنی اب آپ سے وہ جنگ کے لیے تیار ہوگی۔ گو قوت دفع اس میں بہت کم ہے مگر پھر بھی ہے ضرور۔ دنیا کی چیزوں میں سب سے کم قوت دفع ہوا میں ہے کہ ہر جسم کو وہ قبول کر لیتی ہے اور ہر جسم سے وہ ہٹ جاتی ہے۔ لیکن ہوا میں بھی قوت دفع ہے ضرور۔ دیکھ لیجئے کہ فٹ بال جس وقت اس میں ہوا بھری

جاتی ہی تو پھر بڑی قوت صرف ہوتی ہی اُس کے دبانے کے لیے. ہوا کی زیادہ مقدار جس وقت ایک محدود جگہہ پر محبوس ہوجاتی ہی تو شاید وہ قوت دفع مین مقابلہ لوہے وغیرہ سے کرنے لگے۔ معلوم ہوا کہ باوجودیکہ قوت دفع بہت کم مقدار میں ہوا میں ہی مگر پھر بھی قوت دفع اس میں موجود ضرور ہے جس چیز کو بھی آپ لیں اور دبائیں تو معلوم ہوتا ہی کہ کوئی شے ہم سے مقابلہ کر رہی ہے تو وہ چیز جو آپ سے برسر مقابلہ ہی اسی کا نام ہی قوت دفع یعنی اپنے حدود میں کسی غیر کو آنے نہ دے۔ جتنی اس میں قوت دفاع زیادہ ہوگی اتنی ہی آپ کو کاٹنے اور توڑنے میں قوت زیادہ صرف کرنا پڑے گی اور اس میں کسی شے کے نافذ کرنے میں آپ کو دشواری زیادہ پیدا ہوگی۔ اس قوت دفع اور جذب سے آجکل دنیا کے تمام حکما کہتے ہیں کہ تمام کائنات کا وجود ہوا ہے۔ مگر الوہیت کے اقرار کے بعد بھی یہ ضروری نہیں ہی کہ ہم مادیت کے جو اصول فلسفی اور قواعد ہیں ان کا بالکل ہی انکار کردین مگر سوال تو صرف کافی اور ناکافی کا ہی۔ یعنی وہ اس کو کافی سمجھتے ہیں اور ہم اس کو ناکافی سمجھتے ہیں عالم کائنات کے وجود میں نہ یہ ہے کہ مادین اگر مادہ کے خواص کو بیان کرتے ہیں تو موحدین کا فرض یہ ہی کہ وہ ان خواص کا انکار کریں کیونکہ وہ خواص صرف طبعی حیثیت رکھتے ہیں جس طرح ادویہ میں خواص مضمر ہیں اسی طرح سے اور چیزوں میں بھی کم و بیش

موجود ہیں۔ ایک شخص جس کا ایمان کھوٹا ہے وہ اگر منحرف ہو جائے اور نفس اور عالم کے وجود سے انکار کر دے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ تمام اصلی مخلوق ان خواص کے وجود سے منکر ہو جائے اسی طرح سے کائنات کے مختلف اجزاء اور مختلف عناصر میں جو خواص اور خصوصیات ہیں اُن کو مانا جائے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس سے خدا کے وجود کا انکار کر دیا جائے۔ اس بنا پر عالم کائنات کے متعلق جو خواص دریافت کئے گئے ہیں۔ تجربات سے۔ مشاہدات سے عقلی حیثیت سے یا مذہبی حیثیت سے یا کسی جہت سے بھی وہ قابل انکار نہیں ہیں۔ قوت جذب کا نتیجہ ہے اپنی مناسبت سے مرکز کے ساتھ ملنا قوت دفع کا نتیجہ ہے اپنے سے ناگوار چیز کو ہٹانا۔ اگر آپ غور کیجئے تو یہ جذب اور دفع اسکی دوسری تعبیر ہے صلح یا جنگ۔ اس بنا پر کسی کا صلح کو لے کر جنگ سے منحرف ہو جانا۔ یا کسی کا جنگ کو لے کر صلح سے بالکل روگردان ہو جانا۔ یہ عالم طبیعیات کے اصول کے بالکل ہی خلاف ہے جبکہ کائنات میں دونوں ہی قوتیں مضمر ہیں اور دونوں قوتیں اپنا اپنا اثر دکھلاتی ہیں تو کسی ایک قوت کے ساتھ ہو کر رہنا بالکل غیر ممکن ہے کائنات میں جو یہ اسباب مضمر ہیں عالم انسانیت میں بھی بعینہ یہی کارفرما ہیں۔ انسان کا یہ گوشت پوست اور اس کا یہ جسم تو بہرحال اسی عالم طبیعیات کا جزو ہے۔ اس لیئے جو تا دون تمام دنیا کی چیزوں میں مضمر ہے وہی اس انسان کے جسم میں بھی

کارفرما ہے۔ جسمانی حیثیت سے اس کا جذب اور دفع وہی ہے کہ جو تمام اجسام کا ہے۔ یعنی اس انسان کا جذب وہی وزن ہے کہ جو اس انسان میں پایا جاتا ہے یعنی اسے اگر آپ ترازو میں تولیے تو آپ کو وہ بوجھل معلوم ہوگا اور اٹھانے میں بھاری محسوس ہوگا۔ اس میں بھی مختلف درجہ ہیں کوئی زیادہ ہے کوئی کم ہے جس طرح سے دوسری چیزوں میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ کسی میں قوت جذب کم ہے۔ کسی میں زیادہ ہے اسی طرح سے انسان میں بھی باعتبار کیفیت بہت ممکن ہے کہ مقدار میں ایک انسان دوسرے سے بالکل مساوی ہو یعنی قطر میں مثلاً یہ شخص جتنا لمبا ہے اتنا ہی لمبا وہ بھی ہے جتنا چوڑا یہ ہے اتنا ہی چوڑا وہ بھی ہے۔ لیکن پھر بھی ایک کا وزن زیادہ ہے اور ایک کا کم ہے یہ اسی قوت جذب کا نتیجہ ہے بغیر کسی مشابہت اور بغیر کسی تاویل کے اور جس طرح سے تمام دنیا کی چیزوں میں قوت دفع موجود ہے اسی طرح سے اس انسان کے جسم میں موجود ہے۔ مگر انسان کا جسم مختلف اجزا رکھتا ہے اپنے اندر۔ اس لیے ہر ایک کی قوت دفع مختلف ہے یعنی گوشت میں قوت دفع بہ نسبت ہڈی کے کم ہے۔ ہڈیوں میں بھی آپس میں اختلاف ہے۔ کوئی ہڈی نرم ہے اور کوئی سخت ہے یہ اس اعتبار سے تھا کہ انسان کا جسم تمام دنیا کی چیزوں کے ساتھ سلک اجسام میں منسلک ہے لیکن یہ انسان بہ اعتبار اپنے اُس جوہر کے کہ جو اس کو انسان بنانے والا ہے

جس کا نام ہے نفس ناطقہ۔ اس انسان کی قوت جذب مختلف ہو جاتی ہے۔
اُن تمام اجسام سے کہ جن میں یہ خاص قوت مضمر نہیں ہی مگر اُن میں قوت
جذب اور قوت دفع کم و بیش موجود ضرور ہوگی۔ لیکن جس طرح
سے یہ چیز خود جسم نہیں ہے۔ اسی طرح سے یہ جذب اور
دفع بھی جسمانی نہیں ہوگا۔ یعنی اجسام میں قوت جذب کا نتیجہ تھا بوجھل ہو جانا
اس میں بوجھل ہونا نہیں ہی کیونکہ یہ صفت خود جسم سے مخصوص ہے لیکن
بوجھل ہونے کا جو نتیجہ ہی وہ ظاہر ہو جائے گا۔ قوت دفع کا نتیجہ ہی
سخت ہو جانا۔ مگر یہاں یہ سختی ظاہر ہوگی نفس کے ذریعہ سے۔ آپ کو تعجب
نہیں ہونا چاہیے اگر میں دوسرے الفاظ میں یہ کہوں کہ جو نفس شناس
اور فطرت شناس انسان تھے انھوں نے یہ کہا ہی الارواح جنود
مجندۃ فما تعارف منہا ائتلف وما تناکر منہا اختلف روحوں
کو صف باندھے ہوئے تیار شدہ لشکر سمجھیے وہ روحیں جو آپس میں
شناسائی رکھتی تھیں بہ اعتبار اوصاف کے۔ یعنی جو مناسبت رکھتی تھیں
روحیں دوسری روحوں کے ساتھ۔ ایک نفس دوسرے نفس کے ساتھ تو ان میں
آپس میں الفت پیدا ہوی۔ اور جو بہ اعتبار اوصاف ایک دوسرے سے
آپس میں مختلف ہوئیں تو ان میں آپس میں اختلاف پیدا ہوا۔ یہ ہے حقیقت
اس جذب اور دفع کا فلسفہ جو عالم انسانی میں روحانی صورت سے ظاہر ہوتا ہے

بالکل اُسی حیثیت سے کہ جیسے ایک چیز کو زمین سے اُٹھایا تو اُس کے اُٹھانے میں وزن معلوم ہوگا۔ اسی طرح سے اگر ایک انسان کو اس کے وطن سے دور کرنا چاہیے تو اس میں دشواری ہوگی۔ اور وقت محسوس ہوگی خود اسکے نفس کو۔ یہ ہٹانے میں دشواری پیدا ہونا بالکل ہی ویسا ہے جیسا کہ جسم کو زمین سے اُٹھانے میں وزن معلوم ہوتا ہے اس وزن کے محسوس ہونے کے معنی یہ تھے کہ وہ اپنی جگہہ کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہی۔ اسی طرح سے اُس کے اپنے وطن سے علیٰحدہ ہونے میں دشواری محسوس کرنا اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی فطرت اور طبیعت کے لحاظ سے یہاں سے جدا ہونے کو گوارا نہیں کرتا۔ اس کو آپ دوسرے الفاظ میں محبت سے تعبیر کر لیتے ہیں مختلف افراد میں مختلف جماعتوں میں آپ محبت یا اتحاد کے الفاظ سے جس چیز کو تعبیر کرتے ہیں وہ یہی کشش ہے ایک کی دوسرے کی طرف۔ اس کا ایک قوی درجہ وہ ہوتا ہے جس کا آپنے عشق نام رکھا ہی۔ اسی کشش کا عملی نتیجہ ہی اتفاق و اتحاد اور صلح۔ اسکے برخلاف اگر ایک انسان کو آپ جنگل میں لے جانا چاہیں اور وہاں رکھنا چاہیں تو وہاں جاکر اس کا دم اُلٹے گا اور گھبرائے گا وہ کسی طرح سے وہاں رہنے پر راضی نہ ہوگا آپ اس کو وہاں رکھنے پر مجبور کریں تو وہ انکار کرے گا، آپ ہاتھ پکڑ کر رکھنا چاہیں تو وہ ہاتھ چھڑائے گا۔ یہ نتیجہ ہے قوت دفع کا۔ یعنی دور کرنے کی

قوت ناگوار طبع چیز کو جب انسان اپنے لیے پسند نہیں کرتا اور جو [illegible] یت کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی۔ افراد انسانی ہیں مختلف جماعتوں میں مختلف اشخاص ہیں۔ بہ اعتبار اوصاف۔ بہ اعتبار خیالات جو تناسب یا عدم تناسب ہوتا ہی اسی کے لحاظ سے جذب اور دفع کے نتائج مترتب ہوتے ہیں ایک انسان دوسرے کو زیادہ چاہتا ہے اس بنا پر کہ اس کی سیرت کو پسند کرتا ہی۔ ایک شخص کسی دوسرے شخص کو چاہتا ہے اس بنا پر کہ وہ اسکے مساعی کو بہت پسند کرتا ہی اور جس مقصد کے لیے یہ کوشش کر رہا ہی اسی مقصد کے لیے وہ کوشاں ہی اس اتحاد مقصد کے لیے اُس کے ساتھ دلبستگی محسوس کرتا ہی اور اسکو اُس کے ساتھ ایک ارتباط قلبی محسوس ہوتا ہی۔ یہ مختلف چیزیں انسان میں فطری طور پر کچھ نہ کچھ ضرور پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ہم وطنی۔ ہم مذہبی۔ ہم خیالی۔ یہ "ہم" جہاں پایا جائے ہمیشہ اسکے معنی یہ ہیں کہ دو آدمیوں کو ایک نقطہ پر لیجا کر مشترک کر دینا۔ آپ کہیں پردیس میں جائیے۔ اور وہاں آپ کو کوئی وطن کا آدمی مل جائے فوراً اس کو دیکھ کر دل تڑپ جاتا ہی حالانکہ آپ جس وقت تک وطن میں رہے اس وقت تک آپ اس سے ملنے میں گریز کرتے رہتے تھے اور یہ نہیں چاہتے تھے کہ اس آدمی سے گفتگو کریں مگر وہاں جب وہی شخص آپکے سامنے آتا ہی تو آپ خود اس سے ملنے کی تمنا رکھتے ہیں کہ اس آدمی سے جو ہمارا ہم وطن ہے کسی صورت سے ملاقات ہو جائے۔ یہ کس بات کا نتیجہ ہے۔ اُسی ہموطنی کا نتیجہ

حقیقتاً یہ اسکی طرف آپ کا ارتباط نہیں ہے بلکہ جس سے اس کا ارتباط ہی اسی سے آپ
کا بھی ارتباط ہی - یعنی وطن بیچ میں ہے اور یہ محبت اصل میں وطن کی ہی
جو آپ کو اہل وطن کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کرتی ہی اور یہ قانون ارتباط
ایک ایسی چیز ہی کہ جس سے کوئی شخص مستثنیٰ نہیں ہے - یہ قانون محبت ہے کہ جو
کسی شخص کی طرف قلبی حیثیت سے میلان رکھتا ہی - تو وہ جس چیز سے رشتہ رکھتا
ہی اُسکی طرف بھی قلبی تعلق محسوس کرتا ہے - یہ وہ قوت جذب ہی کہ جو انسان
محسوس کرتا ہے اس وحدت کے رشتہ کی وجہ سے جو دو چیزوں کو پیوند دیتا ہے
میں نے کہا کہ اسکے اسباب بہت سے ہوتے ہیں - دو بھائی اس لیے ایک دوسرے
سے محبت کرتے ہیں کہ دونوں کا رشتہ باپ میں متحد ہو جاتا ہی اور وہ باپ
محل ارتباط ہوتا ہی - جتنا یہ ارتباط زیادہ قریب ہوگا اتنا ہی کشش کا اثر
زیادہ نمودار ہوگا اور جتنا یہ دُور ہوگا اُتنی ہی کمی ارتباط میں محسوس ہوگی
یہ اور بات ہی کہ اس قوت کا جو اقتضا ہے اس کے خلاف کوئی خلاف اوصاف
یا خلاف مزاج یا خلاف مقصد پہلو ہو جس سے دفع کا بھی اقتضا پیدا ہو جائے
تو یہ قوت دفع اور قوت جذب دونوں ٹکرا کر ایک درمیانی راستہ پیدا کر دیتی
ہیں کبھی قوت دفع قوت جذب کو مغلوب بنا کر اس حقیقی بھائی باپ یا بیٹے کو
دشمن قرار دیتی ہی تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ قوت جذب وہاں پر موجود
ہی نہیں تھی - بلکہ قوت دفع تھی جس نے اس کے اثر کو باطل کر دیا

معلوم ہوا کہ دنیا میں قوت جذب اور قوت دفع
یہ ایک دوسرے کی طرف میلان اور ایک دوسرے سے تنفر کی ۔ ہوتی ہیں
یہ وہ چیز ہے جس کو کہا جاتا ہے دشمنی۔ اور دوسری وہی چیز ہے کہ جس کو
کہا جاتا ہے دوستی۔ اتحاد۔ اور یگانگت ۔اب اگر آپ دنیا کو ان خاصیات
میں سے کسی ایک کا پابند بنا سکیں۔ یعنی آپ دنیا میں قوت جذب ہی کو کارفرما
بنا دیجئے قوت دفع کو باطل کر دیجیے۔ یا قوت دفع کو باقی رکھیے قوت جذب
کو دنیا سے نیست و نابود کر دیجئے تب آپ کا کسی یک طرف فیصلہ کی طرف جانا
صلح اور جنگ کے معاملہ میں یعنی بلا استثنار صلح کا علم بلند کر دینا۔ یا بلا استثنار
جنگ کا علم بلند کرنا درست ہوگا لیکن جب تک دنیا میں
یہ دونوں نظام کارفرما ہیں اور دنیا میں جذب و دفع کے خصوصیات موجود
ہیں اس وقت تک صلح کو آپ کا بلا استثنا کہنا یہ بھی فطرت سے جنگ ہے
اور جنگ کو بلا استثنار کہنا یہ بھی فطرت سے جنگ ہے یا یہ کہ عدم تشدد بلا استثنار
بغیر کسی قید کے ہر موقع پر اور ہر محل پر یہ بھی اصول فطرت کے خلاف ہے اور یہ
بھی باعث جنگ ہے اور تشدد کے علاوہ کچھ اور نہ ہو یہ بھی اصول فطرت
کے بالکل خلاف ہے لیکن اب آپ یہ ملاحظہ فرمائیے کہ قوت دفع جو جنگ کی
باعث ہے۔ یہ کب کارفرما ہوتی ہے۔ جب کوئی ناگوار طبع۔ یعنی خلاف فطرت
چیز انسان کے مقابلہ میں آئے تب قوت دفع برسرکار آتی ہے۔ یعنی اگر دنیا میں

تمام باتیں سازگار ہوتی رہیں تو قوت دفع کے عمل کا موقع ہی نہیں آئے گا اور ہر چیز سکوت کے ساتھ اپنی منزل حیات پر گامزن رہے گی۔ دنیا میں تصادم یا کشمکش یا قوت دفع کا عمل۔ یہ تمام چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ خلاف طبع صورتیں پیدا ہونے کی وجہ سے۔ اس لئے کہ قوت دفع ہمیشہ مقابلہ چاہتی ہے اس سے کہ جو مخالف ہو تو اگر فطرت کے مطابق ہر بات ہوتی رہے تو کبھی قوت دفع کے ظاہر ہونے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ قوت تو موجود ہے جنگ کی ہر طبیعت میں مگر اس کا عمل اس وقت میں ہوتا ہے کہ جب خلاف فطرت حالات پیدا ہوں اور چونکہ فطرت اپنے خلاف طبع کو ہمیشہ برداشت نہیں کر سکتی اور یہ غیر ممکن ہے یا وہ خود فنا ہو جائے گی یا اپنے مخالف طاقت کو مٹا دے گی۔ اس بنا پر میں یہ کہتا ہوں کہ جنگ کبھی دائمی نہیں ہو سکتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دنیا میں صلح ثابت چیز ہے اور جنگ عارضی۔ دنیا میں سکون ایک طبعی چیز ہے اور جنگ غیر طبعی۔ جہاں دو جماعتوں میں جنگ ہو تو یقیناً سمجھیے کہ صلح بعد میں ضروری ہے اور خلاف جنگ جو صورتیں پیدا ہوں اس کو سمجھیے کہ یہ موافق فطرت ہیں یہ اور بات ہے کہ بنائے مخاصمت کسی سے قائم رہے لیکن جنگ کا دائمی طور سے برقرار رہنا ہمیشہ ناممکن سی چیز ہوگا۔ اس کا دوام و ثبات ہو ہی نہیں سکتا۔ جب کوئی سبب پیدا ہو گا اس کے ابھارنے کا تب وہ ابھرے گی بغیر اسکے یہ صورت ناممکن ہے اور جنگ کا پیدا ہونا

بنائے مخاصمت کا محتاج ہے۔ اور جنگ کا ظہور ہمیشہ ایسے ہی حالات کا نتیجہ ہوتا ہے تو اب ہم بے شک صلح اور جنگ میں بلا استثناء صلح کی ... سے سکتے ہیں نہ بلا استثناء جنگ کی دعوت دے سکتے ہیں اور جیسا کہ میں نے کہا کہ عقلی حیثیت سے وہ بھی فطرت کے خلاف ہے اور یہ بھی فطرت کے خلاف ہے مگر مجھے یہ کہنے کا حق ہے کہ صلح پہلے ہے اور اس کے بعد جنگ۔ یعنی درجہ کے اعتبار سے ترتیب کے اعتبار سے ایک شے اپنے اقتضائے طبیعت پر چھوڑ دی جائے تو صلح ہی صلح ہے لیکن تقاضائے طبیعت کے خلاف ناگوار حالات کے پیدا ہونے پر جنگ ہوتی ہے تو یہ کہنا ہرشلر کا جو فقرات میں نے پہلے پیش کیے تھے کہ دنیا میں پہلے جنگ ہے اور پھر امکان صلح۔ یہ بات بالکل فطرت کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ میں کہوں گا کہ نہیں پہلے امکان صلح ہے اور جب امکان صلح نہ رہے تب جنگ ہے یعنی دو شخصوں میں جو ایک دوسرے کے قریب رہتے ہیں یا ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات رکھتے ہیں پہلے اس کا امکان پیدا کرتا ہے کہ ان دونوں میں ہمیشہ آپس میں اچھے تعلقات قائم رہیں اور نبھ جائے کیونکہ یہ طبیعت کے موافق بات ہے۔ جب نہ نبھے اور دونوں کے تعلقات ناسازگار ہو جائیں تب تدریجی حیثیت سے جنگ کی نوبت پہونچتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں پہلے امکان صلح ہے اور پھر جنگ۔ اور پھر فطرۃً ایک وقت میں اختتام جنگ لازمی ہے خواہ اختتام جنگ صلح کی صورت میں ہو خواہ اختتام جنگ

کسی ایک طاقت کے ختم ہو جانے کی صورت میں ہو۔ لیکن جنگ کا نہ دائمی ہوسکنا
اس بات کا ضامن ہے کہ صلح کا درجہ جنگ کے قبل ہے۔ اور جنگ کے بعد بھی
ایک ایسی صورت کی ضرورت ہے۔ چاہے صلح ہو یا ایک فریق بالکل فنا ہو جائے
معلوم ہوا کہ فطرت کا تقاضا جس کی عام حالات میں دعوت دینا چاہیے وہ
ہمیشہ امن و سکون اور اطمینان و سلامتی ہے۔ اس کے برخلاف صورتیں ہمیشہ
غیر معمولی حالات کی بنا پر پیدا ہونا چاہئیں جبکہ صلح کی کوئی صورت باقی
نہیں رہتی۔ اور اگر صلح کی کوئی بھی صورت پیدا ہوسکتی ہے تو پھر جنگ کی کوئی ضرورت
نہیں۔ میں نے اب تک کوئی آیت، کوئی مذہبی تعلیم۔ کوئی حدیث آپ کے
سامنے نہیں پیش کی بلکہ عقلی حقائق ہیں کہ جو میں نے آپ کو دکھلائے ہیں
اور آپ کے سامنے پیش کئے ہیں۔ اب دنیا کے تمام مذاہب میں آپ تلاش
کر لیجئے کہ کون مذہب وہ ہے کہ جو اپنے تعلیمات میں اسی اصول کی تلقین کرتا ہے
جو مذہب اس اصول کی تلقین کرتا ہے اس کو آپ موافق فطرت تسلیم کریں
اور جو مذہب اس اصول کے خلاف دعوت دیتا ہو اس کو آپ خلاف فطرت
قرار دیں۔ بہر حال میں نے آپ کے سامنے یہ ظاہر کیا کہ مقتضائے فطرت و
طبع فطرت اتحاد و صلح ہے۔ اور ناگوار فطرت وہ حالات پیدا ہونا کہ جن کے
باعث جنگ کرنا پڑے۔ اس کو میں ٹھیٹھ اردو میں کہوں گا کہ صلح تو کی جاتی
ہے بخوشی فطرت کی تحریک سے اگر جنگ کرنا پڑتی ہے۔ اتفاق اور اتحاد تو فطرت

کے تقاضے سے بخوشی کیا جاتا ہے اور لڑائی کا جب وقت آتا ہے تو لڑائی لڑنا پڑتی ہے تو ظاہر ہے کہ ہر وہ چیز جو بہ مجبوری اختیار کی جائے وہ حدود و شرائط کے ساتھ مقید ہوتی ہے اس لیے ایک انسان اُس وقت قابل الزام سمجھا جائے گا جبکہ وہ باوجود امکان صلح کے جنگ کا اقدام کرے ہاں اگر صلح کی کوشش کر لی جائے اور ناکامی ہو تو پھر وہ صورت سامنے آئے گی کہ جو عقلی حیثیت سے جنگ کی نوبت تک پہونچ جائے۔ بہرحال یہ کوشش ہمیشہ کرتے رہنا چاہیے کہ دنیا میں امن قائم رہے۔ لیکن ہرگز یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک قانون ایسا بنایا جائے کہ کوئی شخص لڑے نہیں۔ کیونکہ لڑنا تو فطرت کی مجبوری سے بعض حالات میں ہوتا ہے۔ اگر وہ حالات نمودار ہوں تو لڑنا اسی صورت سے فطری ہوتا ہے جس صورت سے بغیر ان حالات کے پیدا ہوئے صلح اتحاد اور اتفاق قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے مگر یہ صورت تو ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتی جو حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ الفاظ خوشگوار ضرور ہیں۔ نظریات بہت بلند ہیں۔ خیالات بہت اچھے ہیں مگر وہ خیالات کبھی دنیائے عمل میں کامیاب ہو سکیں یہ غیر ممکن ہے خواہ رہنمایان مذہب کے یہ خشک الفاظ ہوں جو کاغذ پر آ گئے ہیں اور خواہ دنیا کے سلاطین کے باہمی معاہدے ہوں خواہ بڑی سے بڑی کانفرنس ہو۔ خواہ اقوام عالم کا اجتماع ہو اگر وہ براہ راست جنگ اور اس کے متعلقات کے اوپر پابندیاں عائد کرے تو وہ پابندیاں کامیابی کی منزل سے روشناس

نہیں ہو سکتیں۔ اس بنا پر کسان اسباب کا سدباب نہیں ہوتا کہ جو اسباب
فطری حیثیت سے جنگ کے دروازے کو کھولتے ہیں۔ کامیاب تعلیم۔ یا کامیاب
قانون محض وہی ہے کہ جو ان اسباب فطری کے نتائج کو پیش نظر رکھتے ہوئے
جنگ کے موقع پر جنگ کی اجازت دے مگر حتی الامکان اُن اسباب
کا قلع قمع کرے جو دنیا میں منافرت پیدا کرتے ہیں اور ان اسباب کو مٹائے
کہ جن اسباب کی بنا پر قوت دفع کارفرما ہوتی ہے یعنی دنیا کے طبائع میں
یک جہتی۔ وحدت۔ ہم آہنگی کا احساس پیدا کرے تاکہ وہ اجنبیت اور مغائرت
جو دنیا میں ایک کو دوسرے سے متنفر بنا کر ایک وقت میں برسرپیکار بناتی ہے
دُور ہو۔ اگر کوئی قانون اتحاد کے جذبات کو بیدار کر رہا ہے اور اس قسم کے
جذبات کو جو جنگ کا باعث ہوتے ہیں دبانے کی کوشش کر رہا ہو تو وہ قانون
وہی ہو گا جو انسان کی رفعت اور بلندی کا سبب ہو گا۔ گو لفظی حیثیت سے
اُس نے مدافعانہ جنگ کی اجازت دی ہو۔ اور اگر قانون ایسا ہے کہ وہ الفاظ
سے تو یہ دعوت دیتا ہے کہ تم خبردار جنگ نہ کرنا لیکن بجائے وحدت پیدا
کرنے کے وہ مغائرت کا احساس زیادہ پیدا کرتا ہے اور بجائے یک جہتی کے
جذبات پیدا کرنے کے وہ جدائی کے جذبات پیدا کرتا ہے تو ایسا قانون گو
لاکھ چلائے کہ تم جنگ نہ کرنا مگر حقیقتاً یہ باعث ہو گا دنیا میں فتنہ وفساد
پیدا کرنے کا۔

یہ معلوم ہو چکا کہ انسان میں بہ تقاضائے فطرت دونوں جذبات موجود ہیں اُسی صورت سے جس طرح کائنات عالم میں دو قوتیں ہیں جذب اور دفع یعنی ہیں اس میں ایک گوارائے طبع چیز کو حاصل کرنے یا اس کے ساتھ متحد رہنے کی طاقت ہے اور دوسری ناگوار طبع چیز کو دور کرنے کی قوت۔ مگر انسان تو اس دنیا میں ایک امتحانی منزل میں قرار دیا گیا ہے یعنی دنیا کی ہر چیز کائنات کی ہر شے تقاضائے فطرت کے پورا کرنے میں آزاد ہے۔ مگر انسان اگرچہ وہ سب سے بلند ہے مگر وہ اپنے تقاضائے فطرت کے پورا کرنے میں مقید ہے۔ کھانا بہ تقاضائے فطرت کھاتا ہے مگر ہر چیز ہر موقع پر جو سامنے آئے بامحل یا بے محل وہ نہیں کھا سکتا۔ سونا بہ تقاضائے فطرت ہوتا ہے لیکن ہر وقت ہر جگہ ہر موقع پر ممکن نہیں ہے بہ تقاضائے فطرت ہنستا ہے۔ بہ تقاضائے فطرت روتا ہے۔ بات کرتا ہے۔ غرضکہ دنیا کے بہت سے کام ہیں وہ سب اس سے بہ تقاضائے فطرت سرزد ہوتے ہیں مگر ان میں سے کسی چیز میں بھی وہ آزاد نہیں ہیں۔ اس کو بہ تقاضائے فطرت بعض کاموں کو بعض مواقع پر پورا کرنے کا حق حاصل ہے مگر بعض مواقع کے اوپر اس کو بعض کاموں کے پورا کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ اور ان ہی حدود کے لحاظ سے اس کی انسانیت وابستہ ہے اور اس انسانیت کے مدارج کی ترقی جو کچھ ہے وہ صرف انسانی حدود اور قیود کے ذریعہ سے وابستہ ہے۔ اس لیے یہ بتانے کے بعد بھی کہ قوت جذب

اور قوت دفع اس انسان میں موجود ہے پھر بھی ہر انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہو سکتا کہ ہر موقع پر اپنی ان قوتوں سے کام بھی لے۔ بلکہ ان قوتوں سے کام لینے کے لیے اس کے اوپر قیود اور حدود کی پابندی لازم ہوتی ہے اور اس اعتبار سے اس کو مورد ملامت یا مورد تعریف قرار دیا جاتا ہے۔ کام ایک ہے جو دونوں انسان کرتے ہیں اور دونوں فطرت کے تقاضے سے کرتے ہیں مگر ایک اپنی فطرت کو بامحل انجام دیتا ہے۔ وہ قابل تعریف ہے۔ اور دوسرا اسی تقاضائے فطرت کو بلا لحاظ شرائط اور قیود کے انجام دیتا ہے وہ قابل ملامت قرار پاتا ہے اب یہ دیکھنے کی ضرورت پیدا ہو جاتی ہے کہ کس موقع پر انسان اگر اپنے اس فطری حق کو استعمال کرے تو وہ اس کا حق ہوگا اور کن صورتوں میں وہ اسے انجام دے تو وہ اس کا حق نہ ہوگا۔ اگرچہ صلح اور جنگ دونوں ہی یہ تقاضائے فطرت ہیں لیکن عام طور پر صلح کے لیے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ کیوں۔ اور جنگ کے لیے یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ کیوں۔ کس لیے اور کس موقع پر۔ یہ حقیقتاً ایک لازمی نتیجہ ہے اس تفریق کا جسے میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ اگرچہ صلح اور جنگ دونوں انسانی قوتوں کے کارفرما ہونے کا نتیجہ ہیں مگر ان قوتوں کے عمل میں ایک کا درجہ مقدم ہے اور ایک کا درجہ مؤخر ہے۔ امن اور سلامتی۔ صلح و آشتی۔ یہ انسان کے لیے مطابق فطرت حالات کا نتیجہ ہے۔ اور جنگ ایک انسان کے لیے خلاف فطرت یا

ناگوار طبع حالات کے پیدا ہونے کی صورت میں عائد ہوتی ہے تو اگر کوئی شخص جنگ کے لیے تیار رہا اس وقت یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ آیا واقعی ایسے غیر طبعی حالات تھے کہ جہاں اس کو جنگ کرنا پڑے یا اس طرح کے حالات پیدا نہیں ہوئے تھے - اگر اس طرح کے حالات پیدا ہوئے ہیں کہ جہاں اس کو جنگ کرنا چاہیئے تو وہ جنگ اس حیثیت سے صحیح قرار دی جائے گی اور اگر اس طرح کے حالات کا نتیجہ نہ ہوا تو وہ جنگ خلاف فطرت قرار دی جائیگی اور اس طرح سے ایک انسان ایسے حالات میں کہ جہاں واقعی مقتضائے جنگ نہیں ہے اور وہ جنگ کا اقدام کرتا ہے مورد ملامت قرار پاتا ہے اس بنا پر کہ اس نے فطرت کی عطا کردہ قوت سے غلط فائدہ اُٹھایا یعنی انسان جب کسی کے سامنے ہاتھ اُٹھاتا ہے تو اس کے اوپر دنیا کی نظریں اُٹھ جاتی ہیں۔ اب تک اس نے جنگ نہیں کی تھی تو کوئی بھی پوچھنے والا نہ تھا کہ کیوں جنگ نہیں کی۔ لیکن جس وقت کہ جنگ کے لیے ہاتھ اُٹھتا ہے تو دنیا اس سے دریافت کرنے پر تیار ہے کہ یہ جنگ کس لیے ہے؟ اس کے معنی یہی ہیں کہ خود دنیا اسکو تسلیم کئے ہوئے ہے کہ عدم جنگ عام حالات کا نتیجہ ہے اور جنگ غیر معمولی حالات کا نتیجہ ہے جس کے لیے سوال کی ضرورت ہے- لڑنے والا بیچارہ اُس کو لڑائی سے فرصت نہیں ہے اور اس طرف یہ سوالات ہیں کہ آپ مقصد جنگ واضح کیجیے اور لطف یہ ہے کہ ہر ایک کو کچھ مقاصد جنگ بیان

بھی کرنا پڑتے ہیں یعنی جنگ کبھی خود مقصد نہیں قرار پا سکتی اور ہمیشہ ایک دوسرے مقصد کے لیے وہ ہو سکتی ہے اس لیے اگر جنگ کی ہے تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ ضرور تراشے گا۔ یہ امر بات ہے کہ کسی کے بیان کردہ اسباب واقعیت کے مطابق ہوں اور کسی کے بیان کردہ اسباب صرف حیلے تراشے ہوئے ہوں مگر بہرحال ہر ایک اپنی جنگ کا مقصد کوئی نہ کوئی قرار ضرور دے گا جس کی وجہ سے وہ حق بجانب قرار پا سکے۔ ہٹلر کا بھی اعلان ہے کہ ہم دنیا میں ظلم و استبداد کو دُور کرنے کے لیے جنگ کرتے ہیں اور جب تک ظلم دنیا سے دور نہیں ہو جائے گا اُس وقت تک ہم تلوار کو نہیں روکیں گے اور مقابل جماعتیں بھی یہ اعلان کرتی ہیں کہ ہم دنیا کی جمہوریت اور حق آزادی کی حفاظت کے لیے جنگ کرتے ہیں اور جب وقت تک دنیا میں یہ استبداد کا دیو مغلوب ہونے گا۔ اور اس کا اثر بالکل نہ زائل ہو جائے گا۔ اُس وقت تک ہم جنگ سے ہاتھ نہیں روکیں گے تو اب آپ ملاحظہ کیجیے کہ صلح و آشتی کے لیے کسی سبب کسی مقصد کے بتلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یعنی وہ خود مقصد ہے۔ مگر جنگ کے لیے یہ ضروری ہے کہ جنگ کے لیے کسی ایسے مقصد کا اظہار ہو کہ وہ جنگ کو صحیح بنائے۔ اب وہ کون سے مواقع ہو سکتے ہیں کہ جہاں انسان کے لیے جنگ کرنا صحیح ہے اور کون سے وہ مواقع ہیں کہ جہاں انسان کے لیے جنگ کرنا صحیح نہیں ہے؟ اُس موقع پر کہ جب خود اس انسان کی حفاظت جنگ

کے اوپر موقوف ہے۔ یعنی اپنی زندگی کا تحفظ یا اپنے سے متعلق چیزوں کا ہے
اس کو یوں کہا جائے کہ ایک دوسرا شخص خلاف فطرت جنگ کرے۔ اور یہ شخص
فریق مخالف کے اقدام کی وجہ سے مجبور ہو جنگ پر۔ تو یہ وہ جنگ ہے کہ جس
کو جنگ دفاعی کہا جاتا ہے۔ ایک فریق نے ہم پر حملہ کیا۔ ہم اپنی حفاظت کے
لیے اور اپنے بچاؤ کے لیے اس سے جنگ کرتے ہیں اس میں بھی دو صورتیں
پیدا ہوتی ہیں۔ ایک طرف صرف سلب ہی سلب ہے اور ایک میں اپنی طرف
سے اثبات بھی ہے ایک صورت یہ ہے کہ بس ہم اپنا بچاؤ کریں اس کے آگے
ہم کوئی اقدام نہ کریں اور دوسری بات یہ ہے کہ نہیں ہم کوئی جوابی جنگ
بھی کریں اپنی حفاظت کے ساتھ۔ اس بنا پر کہ اس نے ہم سے جنگ کی تھی اور
اب ہم خود بھی جنگ کریں۔ دوسری لفظوں میں ایک تو یہ صورت ہے کہ ہم اس
کے وار کو رد کریں اور اپنی حفاظت کرلیں۔ اور دوسری صورت یہ ہے
کہ ہم پر حملہ کیا گیا اور ہم نے حملہ کو خالی دیا رد کیا۔ اور اس کو شکست دی
اور اس کے بعد پھر ہم نے بھی حملہ کیا اور اس کی سند یہ قرار دی کہ چونکہ اس نے
ہم پر حملہ کیا تھا اس بنا پر ہم نے بھی اس کے اوپر حملہ کیا ہے۔ یہ دونوں صورتیں
الگ الگ ہیں۔ پہلے میں صرف حفاظت ہے۔ اور دوسرے میں حفاظت کے
ساتھ ایک تبادلہ کا بھی عنوان ہے ایک معاوضے کی بھی صورت ہے۔ تیسری
صورت یہ ہے کہ وہ ہمارے خلاف اقدام جنگ نہ کرے لیکن ہم خود آگے

بڑھ کر اُس کے خلاف محاذ جنگ قائم کریں۔ یہ وہ چیز ہے کہ جس کو جارحانہ اقدام کہا جاتا ہے۔ جو پہلی دونوں قسمیں ہیں ان میں باہم تفرقہ ہے لیکن پھر بھی وہ پہلی دونوں صورتیں جارحانہ جنگ نہیں سمجھی جاتی ہیں بلکہ دونوں کو مدافعانہ جنگ کہا جاتا ہے لیکن تیسری صورت جارحانہ جنگ کی ہے۔ اس نے ہمارے خلاف حملہ نہیں کیا لیکن ہم اس کے اوپر حملہ کریں دیکھنا یہ ہے کہ عقلی حیثیت سے ان میں سے کون سا موقع وہ ہے کہ جہاں جنگ کرنا صحیح اور درست ہوگا اور کون سا موقع وہ ہوگا کہ جہاں جنگ کرنا درست نہ ہوگا اس کے بعد یہ دیکھنا ہوگا کہ جو جنگ کی جائے اس جنگ کے حدود کیا ہیں اس لیے کہ جنگ جن لوگوں سے کی جاتی ہے ان میں کچھ قابل جنگ ہوتے ہیں اور کچھ قابل جنگ نہیں ہوتے ہیں۔ مثلاً مرد۔ عورتیں۔ بچے۔ مرد نیں جوان۔ بوڑھے۔ سن رسیدہ عموماً اس کے علاوہ شہری اور جنگی لوگ۔ ایک جماعت وہ ہوتی ہے کہ جو جنگ کے لیے تیار کی جاتی ہے اور وہ میدان جنگ میں آتی ہے۔ ایک جماعت وہ ہوتی ہے کہ جو شہر میں اپنے کاروبار زندگی میں مصروف ہوتی ہے کچھ لوگ تجارت کر رہے ہیں۔ کچھ لوگ اپنے گھروں میں ہیں ممکن ہے کہ اگر وہ فوجی تربیت حاصل کریں تو وہ بھی قابل جنگ ہوں مگر وہ عملی طور پر جنگ سے بالکل علیحدہ ہیں۔ تو جب دو فریق میں جنگ ہو تو اس جنگ کے کیا حدود ہونا چاہئیں یہ کہ جس جماعت سے جنگ ہو اُس کے ہر

متنفس کو نیست و نابود کر دیا جائے یا اس میں کچھ حدود قائم ہونا چاہئیں کہ اگر جنگ حق بجانب بھی ہو تو اس جنگ کو ان حدود سے محدود ہونا چاہئیے اور اگر ایسا نہیں ہے تو وہ انسانی جنگ نہ ہوگی بلکہ وہ بربریت کا نتیجہ اور حیوانی جنگ ہوگی۔ تعجب یہ ہے کہ آج کل کی متمدن دنیا جو تہذیب کے اندر نقطۂ عروج پر ہے اس نے جو طریقۂ جنگ اختیار کر لیا ہے اس میں اس نے ان قیود اور مراعات کو غیر ممکن قرار دے دیا ہے اور اس میں ان شرائط کی پابندی کرنے کا امکان نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ اس وقت میں جسے دور حیوانیت کہا جاتا ہے۔ دنیا میں ان شرائط کی رعایت کی جاتی ہو۔ لیکن عالم تہذیب اور تمدن کی ترقی میں جو جنگ کی صورتیں دنیا میں پیش کی جا رہی ہیں وہ ان اصول جنگ سے بالکل علحدہ ہیں اور حقیقی معنوں میں ان کو حیوانیت سے تعبیر کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ واقعی حیثیت سے جنگ جو صحیح قرار پا سکتی ہے وہ ان میں سے کون سا طریقۂ جنگ ہے۔ دنیا میں اگر جنگ کا سب سے زیادہ یقینی درجہ حقیقت کا ہو سکتا ہے تو وہ صرف پہلا طریقۂ جنگ ہے۔ یعنی ایک دشمن ہم پر حملہ کرتا ہے اور جس وقت ہم کو اپنی زندگی کے ضایع ہونے کا خوف ہو اور ہم اتنا سامان کر لیں کہ جس سے ہماری حفاظت ہو جائے تو ہم اس کے حملہ کو رد کر دیں یہ وہ یقینی صورت ہے کہ جس میں میں سمجھتا ہوں کہ عقلی حیثیت سے گنجائش کلام نہیں ہے اور اس کو

پہلے تصور کیا جا چکا ہے کہ یہ کہنا کہ ہر موقع پر عدم تشدد اختیار کیا جائے دنیا کی فتنہ پرور جماعتوں کی ہمتیں بڑھانا ہے اور ان کے فتنہ و فساد میں اضافہ کرنا ہے۔ یہ نام کو عدم تشدد ہے۔ لیکن حقیقتہً اس عدم تشدد میں تشدد کا جرثومہ مضمر ہے۔ اگر آپ دنیا کو کبھی ایسا بنا سکئے کہ ایک شخص دوسرے کے خلاف دست تعدی نہ اٹھائے۔ اگر دنیا کو ایسا بنا سکیے کہ دنیا میں ہر شخص شریفانہ خیالات سے معمور ہو۔ اگر ہر انسان انسانیت کی قدر جانتا ہو تو بیشک یہ عدم تشدد کی تلقین صحیح اور درست ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر دنیا کہنے کو تو انسانوں کی دنیا ہے لیکن اس دنیائے انسانیت میں فی صدی ۹۹ جانور بستے ہیں۔ یہ نام کو انسانوں کی آبادی تو ہے مگر حقیقتاً یہ چلتی پھرتی مورتیں ہیں انسانوں کی اور یہ بیجان مجسمے ہیں جو ادھر ادھر پھر رہے ہیں۔ لیکن انہیں وہ روح نہیں ہے کہ جو انسان میں ہونا چاہیئے۔ جس وقت دنیا کا یہ انداز ہے جس وقت انسانوں کے صحیح حالات کا خاکہ یہ ہے تو اس وقت میں یہ تلقین کرنا کہ ہر شخص عدم تشدد سے کام لے اور دوسرے کے مقابلہ میں اگر وہ زیادتی کرے بھی تو سر جھکا دے۔ یہ ویسا ہی ہے جس طرح سے آپ اس کی تبلیغ کیجئے کہ درندے کے سامنے انسان کو عدم تشدد سے کام لینا چاہیئے۔ سانپ ڈسنے کے لیے بڑھتا ہے تو اس کے سامنے عدم تشدد سے کام لو۔ اگر اس کے سامنے عدم تشدد آپ کا کارگر ہو سکتا ہے تو ان انسانوں کے سامنے بھی عدم تشدد

کارگر ہوسکتا ہے کہ جو انسان نما درندے ہیں اگر عقلی اصول یہ بتلاتا ہے کہ شیر سامنے آتا ہے تو اس کا مقابلہ کرو۔ اگر سانپ سامنے آتا ہے اور اس سے انسان کو صدمہ پہونچنے کا امکان ہے تو اس سانپ کا منھ کچل دینا انسانیت کے لیے مفید ہے اگر دنیا کی تمام چیزوں میں یہ قانون نافذ ہے تو انسانوں میں بھی وہی قانون نافذ ہونا چاہیے۔ اگر اس کے خلاف کوئی قانون نافذ کیا جائے گا یا کوئی تعلیم دی جائے گی تو وہ تعلیم حقیقتاً دنیا میں اس انسان نما حیوانیت کے اضافہ کا باعث ہوگی۔ وہ اس حیوانیت کے ترقی دینے کا باعث ہوگی اور یہ ہرگز انسان کی صحیح خدمت نہیں ہوسکتی۔ اس بنا پر اس قسم کے عدم تشدد کی تلقین جو حقیقی دفاع اور حقیقی حفاظت خود اختیاری سے بھی محروم کردے ہرگز صحیح نہیں ہوسکتی

اس کے بعد دوسری منزل جوابی جنگ کی آتی ہے یعنی ایک انسان نے جو خلاف اقدام کیا تھا ہم دوبارہ اس سے جنگ کرسکتے ہیں اس بنا پر کہ اس نے ہم سے جنگ کی۔ یہ صحیح اور درست ہے یا نہیں میں سمجھتا ہوں کہ اس میں دو صورتیں ہیں پہلی صورت تو یہ ہے کہ ایک مرتبہ اُس نے ہمارے خلاف اقدام جنگ کیا اور اب وہ اپنے ان خیالات اور ان جذبات سے جو محرک جنگ تھے اور اپنی اس خونریزی سے جس کا اس نے ہمارے متعلق ارادہ کیا تھا باز آگیا ہے۔ یعنی ہمارے خلاف اُس نے اس قسم کے خیالات چھوڑ دیئے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اب اپنے پچھلے اقدام پر پشیمان ہے اگر اس قسم کی صورت ہے تو ہرگز جوابی جنگ

جائز اور صحیح نہیں ہو سکتی - اور یہ جوابی جنگ حقیقۃً جارحانہ حملہ قرار پائے گی۔ لیکن اگر اس نے ہمارے خلاف کوئی اقدام کیا اور ہم نے اس کے اس اقدام کو ناکام بنا دیا لیکن پھر بھی وہ اپنے ان خیالات پر قائم رہا اور پھر بھی اپنے دماغ میں وہ آخری جنگ کا عزم رکھتا ہے اور اب بھی ہمارے خلاف جب موقع ملے اس وقت میں جنگ کے لیے آمادہ ہو جائے گا اور تیار ہو جائے گا - اس وقت میں اگر جوابی جنگ کی جائے تو یہ جوابی حملہ ایک قسم کی تادیب - ایک طرح کی تنبیہ ہوگی - اگر دنیا میں جرائم کی سزا کا قانون درست ہے - اگر دنیا میں قصاص کا حق صحیح ہے تو بے شک اس قسم کی تادیب درست قرار پا سکتی ہے بشرطیکہ وہ ان ہی حدود میں رہے کہ جن حدود میں مخالف کی طرف سے اقدام ہمارے خلاف ہوا ہے یعنی فریق مخالف نے ہمارے خلاف جس حد تک اقدام کیا تھا اور جتنا صدمہ پہونچایا تھا تو ہم اس کے عوض میں اتنا ہی نقصان پہونچا دیں تو یہ عقلی اصول سے صحیح ہوگا ۔ اور یہ سزا ایسی ہوگی کہ جو دنیا کی اصلاح کے لیے ضروری ہے - اگر چوری کی سزا موجود ہے - اگر دنیا میں دوسرے قسم کے جرائم کی سزا موجود ہے تو اس قسم کی جارحانہ جنگ کی جس نے ہم کو تکلیف پہونچائی اسی حد تک اس کو سزا دی جائے تو یہ خلاف عقل اور فطرت کی رو سے قابل اعتراض بات نہ ہوگی - لیکن تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی ہم سے کچھ متعرض نہیں ہے - ہم سے کوئی مطلب بھی نہیں رکھتا ہے

اور ہم اُس پر حملہ کریں اور اس سے جنگ کیلیے تیار ہوں یہ ایک بہت بڑا دشوار گزار نقطہ ہے اور ایک بہت ہی مشکل منزل ہے جس کے متعلق ظاہری طور پر انسان کہہ دے گا کہ ایسی حالت میں جنگ کرنا کوئی صحیح بات نہیں ہے لیکن ابھی اس موقع پر فیصلہ صادر کر دینا۔ اور کوئی کلیہ ایسا کہ جو مختلف صورتوں کو علیحدہ علیحدہ قرار دے کہ کن صورتوں میں جنگ درست ہے اور کن صورتوں میں جنگ درست نہیں ہے یہ ایک دشوار بات ہے دیکھنے میں ایک معمولی مثال آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کھڑے ہوئے ہیں۔ آپ کے بازوؤں میں طاقت ہے۔ تلوار آپ کے پاس موجود ہے۔ یعنی آپ میں ہر طرح کی مقابلہ کی قوت ہے۔ اور آپ ایک طاقتور انسان کو دیکھیے کہ وہ ایک بچہ کو جو کمزور ہے جس کے پاس مدافعت کی طاقت نہیں ہے دیوچے ہوئے اس کے گلے پر چھری چلانا چاہتا ہے۔ آپ کے اوپر تو حملہ نہیں ہوا ہے۔ آپ اگر آگے بڑھیے گا تو یہ آپ کی طرف سے جارحانہ اقدام ہوگا نہ مدافعت ہے۔ نہ یہاں فریق مخالف کی طرف سے آپ کے مقابل میں جارحانہ اقدام ہے۔ آپ کے ساتھ نہ اس نے کچھ کیا ہے اور نہ اس کا کچھ ارادہ ہے آپ سے کوئی مطلب نہیں ہے مگر عقل اور فطرت کی رو سے آپ کا یہ فرض ہے کہ آپ اس بچہ کی زندگی کی بقا کے لیے اپنی قوت سے مقابلہ کیجیے اور اس کے پنجے سے اس کو چھڑائیے یہاں اگر آپ وعظ اور نصیحت پر اکتفا کیجیے تو اپنے فرض سے کیا آپ سبکدوش ہو جائیں گے یہاں پر عدم تشدد سے کام لینا یا تلقین کرنا کافی ہے یا یہ کہ آپ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اس کے تشدد کے مقابلہ میں جوابی تشدد کریں اور کسی نہ کسی طرح اس کو اس ارادہ سے باز رکھیں

اب اگر اس بچے کی حفاظت کے سلسلہ میں مجبوراً آپ کی تلوار نے اس ظالم انسان کی جان بھی لے لی اور سر کو مار بھی ڈالا تو کوئی شخص آپ کو قابل ملامت نہیں سمجھے گا۔ میں تو کہہ چکا ہوں کہ حقیقتہً ایسے انسان کو انسان نہیں سمجھنا چاہیے۔ اگر سانپ انسان کے پیر میں کاٹنے کیلئے دوڑ رہا ہو اور آپ کے ہاتھ میں لکڑی ہو تو آپ کا فرض ہے کہ آپ اس سانپ کو مار ڈالیں۔ اسی لیے میں سچ کہتا ہوں کہ اس ظالم انسان کے اس خط و خال سے جو انسان سے مشابہ ہیں دھوکا نہ کھانا چاہیئے بلکہ اس بیگناہ کی حفاظت کیلئے آپ ایک ایسی مخلوق کو جو ایک بیگناہ کو فنا کرنا چاہتی ہے اگر رستہ سے ہٹا دیں تو بیجا نہ ہوگا بلکہ اپنے اس اقدام سے آپ انسانیت کی خدمت انجام دینگے۔ اب اس صورت میں کیا آنکھ بند کرکے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جارحانہ جنگ کرنا ہر موقع پر فطرت کے اعتبار سے اور قانون کے اعتبار سے ناجائز ہے اور کوئی مجھے سمجھا دے اتنا کہ یہ اقدام مدافعت کے تحت میں داخل ہوتا ہے اس کے معنی یہ نہیں کہ میں آپ کے سامنے گویا ایک کلیہ بنا رہا ہوں کہ جو بچہ سامنے ہو اور اس کے گلے پر چھری پھر رہی ہو تو اس کی جان کی حفاظت کرنا آپ کے اوپر فرض ہے۔ یہ تو ایک مثال تھی کہ عام انسانی جذبات کے لحاظ سے ہر ایک شخص متاثر ہوکر اس کا اقرار کرے کہ حقیقتہً یہ موقع ایسا ہے کہ اس ظالم انسان کو اس کے کیفر دار تک پہونچایا جائے لیکن کیا انسان کی جان ہی قابل حفاظت ہو سکتی ہے؟ اگر ایک شریف خاتون کی کوئی برسر راہ عصمت دری کرنا چاہتا ہو اور وہ آپ سے فریاد کر رہی ہو کیا کہا ہے اس موقع پر اگر اس کی آبرو کی حفاظت کے ذیل میں اس ظالم کو کوئی آپ کے ہاتھ سے گزند پہونچ جائے تو کوئی قابل اعتراض بات ہو سکتی ہے؟ یہ کیا ہے حفاظت جان بھی تو یہاں پر نہیں ہے۔ اگر یہاں جان عام انسانی اصول کی بنا پر بچانا فرض کے برابر یا اس سے کم ہے تو شرافت کے تحت اس کو قتل کر ڈالنے میں بھی آپ پر الزام نہیں

قرار پا سکتے اس لیے کہ بسا اوقات آبرو جان سے زیادہ اہم سمجھی جاتی ہے ایسے موقعوں پر آپ کو
عقل اور انسانیت کی طرف سے فتویٰ ملے گا کہ اس موقع پر بیشک اپنی طرف سے کوتاہی کرنا
حفاظت میں جائز نہیں ہے جبکہ منع کرنے پر کام نہیں چل سکتا ہے۔ تہدید کا ۔ کام نہیں
چل سکتا ہے تو ایسی صورت میں آگے نہ بڑھنا خلاف فطرت ہوگا لیکن صورت مفروضہ یہی
ہے جب یہ پست درجہ ناکام ثابت ہوں جب ان چیزوں سے کوئی فائدہ نہ حاصل
ہوتا ہو تو ایسے وقت میں اقدام درست ہوگا۔ میں نے آپ کے سامنے دوسری جو
مثال پیش کی یعنی ایک شریف خاتون کی آبروریزی تو اب شاید آپ کو کلیہ بنانا آسان
ہوگا یعنی ہر وہ چیز جو انسانیت کے نقطۂ نظر سے قابل حفاظت ہو۔ اگر اس کو کسی فرد
یا کسی جماعت کے ہاتھوں سے نقصان پہنچ رہا ہو تو ایسے وقت میں انسان کا انسانی
حق ہے کہ وہ اس قابل حفاظت چیز کی حفاظت کے لیے اقدام کرے مگر یہ وہ نقطہ ہے کہ
جہاں حق و باطل دونوں آکر مل جاتے ہیں اور تفرقہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ آب در سراب
حقیقت اور مجاز انسان کے سامنے آکر انسانی نگاہ امتیاز کو غلط فریبی میں مبتلا کر دیتے
ہیں۔ یہاں آکر پھر حق و باطل میں تفرقہ مشکل محسوس ہونے لگتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے
کہ ایک شخص کے نزدیک کوئی مقصد قابل عزت ہو۔ قابل حفاظت ہو۔ اور وہی مقصد
دوسرے کے نزدیک قابل حفاظت نہ ہو تو یہاں آرا و نظریات میں تفرقہ پیدا ہو جائے
گا۔ کوئی کہے گا کہ صحیح ہے۔ کوئی کہے گا غلط ہے مگر یہ یقینی ہے کہ ہم کو جارحانہ جنگ
میں یعنی وہ جو پہلے معیار کی بنا پر جارحانہ قرار پاتی ہے۔ اس میں یہ تفریق قرار دینا
ضروری ہے اور بغیر اس کے دنیا کا نظام درست نہیں ہو سکتا اور بغیر اس کے انسان کے
جو عام اصول ہیں وہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچ سکتے اب جس قسم کی جنگ ہو خواہ دفاعی
یا جبالی یا جارحانہ (جبکہ بلند مقاصد کے لیے وہ ضرورتاً ٹھہرتی ہو) تو اس جنگ کے حدود
کیا ہونے چاہئیں یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ کبھی گنہگار کی زد بیگناہ پر پڑنا
درست نہیں ہے یعنی اگر کوئی جماعت مفسدہ پرداز ہے یا جنگ کے لیے تیار ہے یا صدمہ
پہونچاتی ہے کسی بلند مقصد کو تو اس جماعت میں یہ تفرقہ قرار دینا لازمی ہے کہ انہیں
سے کون وہ ہیں جو اس کے ذمہ دار ہیں اور کون وہ ہیں کہ جو اس کے ذمہ دار نہیں ہیں
یعنی ایک جماعت آپ سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس کے مردوں کو قتل کر ڈالا

مگر اس جماعت کی عورتوں نے کیا تصور کیا ہے - اور آپ کا اس طرح سے حملہ کرنا کہ کوئی بھی متنفس باقی نہ رہے جتنے ہیں وہ سب کے سب فنا ہو جائیں بلکہ یہ ممکن ہے کہ جو مجرم ہیں وہ بچ جائیں اور جو بیگناہ ہیں وہ تباہ ہو جائیں گولے برسنے میں کیا ہوتا ہے فوج کی چھاؤنیاں تو بچ جاتی ہیں مگر اسپتال تباہ و برباد ہو جاتے ہیں صاحبان طاقت و قوت سپاہی خندقوں میں جا کر چھپ جاتے ہیں اور امن پسند شہری جو اپنے کاروبار میں مصروف ہیں ان کے چھپانے کے لیے خندقیں بھی کارگر نہیں ہوتی ہیں وہ مر جاتے ہیں - اسی لیے تو یہ کہا جاتا ہے کہ جس کو دنیا میں انسانیت کی ترقی کہا جاتا ہے وہ نظر کا دھوکا ہے - حقیقۃً انسانیت گرتی جاتی ہے اور تمدن و تہذیب پستی میں جا رہے ہیں لیکن دنیا والے کہتے ہیں کہ تمدن ترقی کر رہا ہے اور روشنی کا زمانہ ہے مگر انسانیت کا فتویٰ اس کے خلاف ہے وہ کہتا ہے کہ ہر اس طرح کی جنگ جس میں مجرم اور غیر مجرم میں امتیاز نہ ہو سکے - ایسی جنگ جس میں گناہگار کے ساتھ بے گناہ بھی تباہ ہو جائیں - ایسی جنگ کہ جس میں قابل جنگ اور ناقابل جنگ کی تفریق نہ ہو سکے عقل کی رو سے کبھی درست نہیں ہو سکتی اس طرح حملہ کرنا کہ جس سے شہر برباد ہو جائیں جس سے عورتیں بچے مرد خواہ وہ بیمار ہوں خواہ وہ صحیح ہوں وہ سب ہی شکار ہو جائیں اس طرح کی جنگ انسانیت کی رو سے درست نہیں ہو سکتی - یہ وہ چیزیں ہیں کہ جن کو بربریت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن بربری لوگوں نے کبھی ایسا نہیں کیا - اب میں سمجھتا ہوں کہ بربریت کے بجائے ہٹلریت یا مسولینیت کے الفاظ کا استعمال ہو اور بربریت کے لفظ کو لغت سے نکال دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا اور یہی طریقہ جنگ ہے کہ جس کو قانون فطرت سند نہیں رکھتا اب یہ اصول جو آپ کے سامنے پیش کئے گئے ہیں ان تمام اصول کی روشنی میں آپ مذہبی تعلیمات کا بھی جائزہ لے سکتے ہیں کہ مذہبی تعلیم اس سے کہاں تک مطابق ہے اور کہاں تک مخالف اس کے بعد ان لڑائیوں کی نوعیت بھی آپ کی سمجھ میں آ جائے گی جو اسلام کی تاریخ میں آپ کی نظر کے سامنے آتی ہیں - والسلام

علی نقی النقوی عفی عنہ

نمبر شمار	نام رسالہ	قیمت	خرچ ڈاک
۵۴	خلافت و امامت حصہ چہارم	۳/	۱/-
۵۵	شہدائے کربلا حصہ دوم	۵۰/	۱/-
۵۶	آل و الائمہ کے تعلیمات	۴/	۱/-
۵۷	حسینؑ کا پیغام عالم انسانیت کے نام	۱/	-/
۵۸	اسلامی عقائد	۲/	-/
۵۹	آثار باقیہ	۱/	-/
۶۰	صحیفہ سجادیہ کی عظمت	۱۰/	-/
۶۱	خلافت و امامت حصہ پنجم	۶/	۱/-
۶۲	خدا کی معرفت	۸/	۱/-
۶۳	شہدائے کربلا حصہ سوم	۱۲/	۱/
۶۴	خلافت و امامت حصہ ششم	۸/	۱/-
۶۵	دی لاسٹ مسیج آف حسینؑ	۲/	-/
۶۶	ہمارے رسوم و قیود	۲/	-/
۶۷	شیعوں کی تازہ زندگی	۱/	-/
۶۸	صحیفہ اعمال مترجم	عہ/	۳/-
۶۹	مذہب شیعہ اور تبلیغ	۴/-	-/
۷۰	اسیری اہل حرم	۱۰/	-/
۷۱	دی مشن آف حسینؑ انگریزی	۱/	-/
۷۲	نظام زندگی حصہ اول	۴/	۱/
۷۳	〃 حصہ دوم	۵/	۱/
۷۴	حقیقت اسلام	۱۰/	-/

نمبر شمار	نام رسالہ	قیمت	خرچ ڈاک
۷۵	مظلوم کربلا	۲/	-/
۷۶	دی مارٹر آف کربلا انگریزی	۱/-	-/
۷۷	تناسخ پر مختصر بحث	۲/	-/
۷۸	نظام زندگی حصہ سوم	۷/	۱/
۷۹	حیات قومی	۱/	-/
۸۰	جبر و اختیار	۱/	-/
۸۱	مذہب اور عقل	۹/	۱/-
۸۲	حسینؑ کا پیغام عالم انسانیت کے نام		
	گجراتی ترجمہ 〃	۲	-/
۸۳	سندھی 〃 〃	۲/	-/
۸۴	ہندی 〃 〃	۱۰/	-/
۸۵	بنگالی 〃 〃	۲/	-/
۸۶	ذرات ازلی نہیں اردو	۱/	-/
۸۷	اقوام عالم میں عورت کا معیار	۴/	۱/-
۸۸	نظام زندگی حصہ چہارم	۵۰/	۱/-
۸۹	جبر و اختیار (قسط دوم)	۱/	-/
۹۰	مسئلہ دعا	۱/	-/
۹۱	صلح اور جنگ	۳/	-/

حضرات [illegible] علمی ادبی اخلاقی و دینی [illegible]

فہرست امامیہ مشن بک ایجنسی لکھنؤ

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	خرچہ ڈاک	نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	خرچہ ڈاک
۱	کائنات قبل از اسلام	۲ر	شر	۱۸	تبرے کی حقیقت	۳ر	ار
۲	قاتلان حسینؑ کی گرفتاری	۸ر	۲ر	۱۹	حسینؑ اور مذہب	ار	شر
۳	مجمع دینیات	عمر	۲ر	۲۰	فتح مبین	۳ر	شر
۴	ذخیرۃ الاحکام	۴ر	لر	۲۱	الشیعہ	۳ر	ار
۵	صحیفۂ تجلی	۸ر	لر	۲۲	ثبوت تقیہ	۱۰ر	شر
۶	رجال بخاری حصہ دوم	۶ر	لر	۲۳	ذاکری کی پہلی کتاب	۳ر	ار
۷	تاریخ ازدواج	۸ر	ٹر	۲۴	" حصہ دوم	۳ر	ار
۸	الہامی کلمات	۳ر	ار	۲۵	شادی خانہ آبادی	۲ر	شر
۹	ہمارے رسولؐ	۲ر	ار	۲۶	گاؤکشی اور مسلمان	۶ر	شر
۱۰	ہماری خاتون جنت	۲ر	ار	۲۷	ہمارے نبیؐ	۱۰ر	شر
۱۱	قاتلان عشاق	۵ر	۸ر	۲۸	ہدایت الاطفال	ار	شر
۱۲	محافل و مجالس چہاردہ معصومینؑ	۱۲ر	۲ر	۲۹	ہدیۂ آصفیہ	۳ر	ار
۱۳	شہزادۂ علی اصغر	۶ر	لر	۳۰	گل عصمت	۶ر	شر
۱۴	ملیکۂ اسلام	۳ر	شر	۳۱	تاریخ حسینی	۹ر	ار
۱۵	حصول اسلام کی حقیقت	۴ر	ار	۳۲	ذاکری کی دوسری کتاب حصہ اول	۸ر	لیہ
۱۶	تقیہ	۲ر	شر	۳۳	قرآن اور حسینؑ	۴ر	شر
۱۷	میزان محبت	۳ر	ار	۳۴	میلاد النبیؐ	۰ر	شر

ملنے کا پتہ:- سکریٹری امامیہ مشن رجسٹرڈ لکھنؤ

پرنٹر نثار علی رضوی   پبلشر سید مصطفیٰ حسن رضوی سکریٹری امامیہ مشن رجسٹرڈ لکھنؤ